KitaabPoint.blogspot.com

آگے سمندر ہے

''یہ اصل میں اس زمانے کا ذکر ہے جب عبدالرحمن اول کے بوئے ہوئے کھجور کے درخت پر سوا دو سو برس گزر چکے تھے اور اس کے آس پاس کتنے درخت اگ چکے تھے۔ صحرائے عرب کی حور اندلس میں رچ بس چکی تھی۔ قرطبہ' اشبیلیہ' غرناطہ' طلیطلیہ کے گھروں کے صحن اب اس کے اپنے گھر تھے۔ اور اشبیلیہ میں بیٹھے ہوئے بزرگ شیخ ابوالحجاج یوسف الشہر بولی کے کچے گھر کے صحن میں کنوئیں کے برابر کھڑی کھجور اتنی پھیل گئی تھی کہ مریدوں کو وضو کے لئے کنوئیں سے.....''

''یار جواد'' مجو بھائی نے مجھے گھور کے دیکھا اور میری بات بیچ ہی میں رہ گئی۔ ''تم عجیب آدمی ہو۔''

''کیوں' کیا ہوا۔''

''بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور تم اسے کہاں لے گئے۔ بات کو گول کرنا کوئی تم سے سیکھے۔''

بات کہاں سے شروع ہوئی تھی' اب میں خود مخمصہ میں پڑ گیا۔ اصل میں بات درختوں پر آ جائے تو پھر میرے لئے اور سب باتیں پیچھے چلی جاتی ہیں۔ تو اب میری دانست میں تو بات درختوں ہی سے شروع ہوئی تھی۔ مگر آخر اس سے پہلے بھی تو کوئی بات ہوئی ہوگی جس سے درختوں کے ذکر کی تقریب پیدا ہوگئی۔ مگر اس طرح سے دیکھیں تو پھر تو کسی بات کی ابتدا کا پتہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ ہر بات سے پہلے بھی کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ تو بس سمجھ لیجئے کہ بات درختوں سے چلی تھی۔ عجب بات ہے' بات کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔ مگر ختم کہاں ہوتی ہے۔ یہی تو مسئلہ ہے' کاش کہیں جا کر ختم بھی ہو جایا کرتی۔ تو اصل میں بات درختوں ہی سے چلی تھی۔ بلی کی بات تو بعد میں نکلی' بالکل اسی طرح جیسے بات سے بات نکلتی ہے۔ کہیں بعد میں جا کر وہ میرے لئے ماجرا بنی۔ اس دھرتی پر سب سے بڑا ماجرا تو درخت ہے۔ دیکھنے میں جھاڑ جھنکاڑ' کوئی غیر بات نظر نہیں آتی۔ بس کھڑے ہیں' مگر کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب کوئی درخت ایک ماجرا بن جائے۔ بھاری کولھوں لمبی سڈول رانوں والی تاراولی اپنے سوامی کے سنگ چلی جا رہی تھی کہ بیچ رستے میں ایکا ایکی آندھی چل پڑی۔ پھر کیا ہوا۔ آندھی جب تھمی تو تاراولی نے دیکھا کہ اس کا سوامی آس پاس کہیں نہیں ہے اور وہ بن میں اکیلی ہے۔ سوامی تم کہاں ہو؟ بہت پکارا' بہت بلاپ کیا' بیاکل بن بن ماری پھری۔ سوامی کا کہیں کھوج نہ ملا۔ ماری ماری پھر رہی تھی کہ ایک برکش کو دیکھ کے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ سوگندھت پھولوں سے لدا ہوا تھا اور مکھیاں ان پھولوں پہ بھنبھنا رہی تھیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

پھولوں کو دیکھ کے وہ موہت ہوگئی۔ پھر کیا ہوا' برکش کی سوگندھ اس پہ ایسی چھائی کہ وہ مکھی بن گئی۔ مکھی بن کے وہ بھی مکھیوں کے سنگ اڑ کے ایک پھول پہ جا بیٹھی۔ مکھی بن گئی پر سوامی کو نہیں بھولی' پھول پہ بیٹھے بیٹھے وہ سوامی کو یاد کر کے روئی۔ آنکھ سے جو آنسو ٹپکا اس سے وہ پھول تر بتر ہوگیا۔ اسی آن اس نے دیکھا کہ اس کا سوامی تو اسی برکش کی چھاؤں میں بسرام کر رہا ہے۔ وہ تو پھول سماں کھل اٹھی اور آن کی آن میں پھر مکھی سے تاراولی بن گئی۔ بچھڑے مل گئے اور اپنے رستے پہ چل پڑے۔ پھر کیا ہوا' وہ جو ایک پھول تاراولی کے آنسو سے شرابور ہوگیا تھا اس سے ایک پھل پھوٹ پڑا۔ اور ایسا ہوا کہ اس گھڑی جب ایک جوگی اس برکش کے پاس سے ہو کر جا رہا تھا وہ پھل پک کے گرا اور گر کے پھٹ گیا۔ پھٹا تو اس کے بھیتر سے ایک سندری نکلی' کومل بھاری' گات پھولوں کی کیاری' بال گھٹا سے' گال لال لال' ہونٹ رس بھرے' نین مرگ کے سے' ہاتھ جوڑ کے جوگی جی کو پرنام کیا اور چرن چھوئے' جوگی نے اسے دیکھ کے اچرج کیا' پر ترنت ہی اپنی ودیا سے اسے پہچان لیا" ہے سندری تو تو تاراولی کی کنیا ہے۔"

"ہے مہاراج' کون تاراولی۔"

"ارے وہی بھاری کومل لمبی سڈول رانوں والی تاروالی جو مکھی بن گئی تھی۔ اس بھید بھرے برکش کے موہ میں جو پھنس گئی تھی۔ مکھی بن کے پھول پہ بیٹھی' اس سنجوگ سے پھول پھل لایا اور اس سے تو جنمی۔ اچھا تو تیرا نام ونے دتی ہے آج سے۔ چل میرے ساتھ اور میری کٹیا میں میری پتری بن کر رہ۔ تیرا سوامی بھی بس آتا ہی ہوگا۔"

"مہاراج' میرا سوامی تو کوئی نہیں۔"

"تو نے تو ابھی آنکھ کھولی ہے۔ تجھے کیا پتہ' پردہ ہے۔ اسی بن میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ ابھی آئے گا' اور پھر اس سے تیرا بواہ ہوگا۔"

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ' کسی ملک میں تھا' کوئی بادشاہ۔ ایک ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ ہاں یہ کہانی مجھے پھوپھی اماں نے سنائی تھی۔ پھوپھی اماں کو کہانیاں بہت یاد تھیں۔ میمونہ اور میں دونوں' وہ ان کی اس بغل میں اور میں ان کی اس بغل میں۔ نہیں پھوپھی اماں' پہلے وہ لکڑ ہاڑے والی کہانی۔ ہاں ہاں وہی لکڑ ہاڑے والی کہانی ہے۔ اس ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ وہیں کہیں ایک لکڑ ہاڑا بھی رہتا تھا۔ بادشاہ کی ایک بیٹی تھی۔ نازوں کی پلی شہزادی' مگر بیچاری ملکہ محل میں آئی تو اس نے تو یتیم بچی پہ ایسے ستم ڈھائے کہ روز نو کوڑی بانس اسے لگواتی۔ ایک دن تنگ آ کے وہ شہزادی گھر سے بھاگ جنگل میں نکل گئی۔ پیچھے سوتیلی ماں کے بھیجے ہوئے سپاہی۔ کیا کرے کہاں جائے۔ سامنے ایک درخت دکھائی دیا۔ بہت اونچا بہت گھنا۔ جا کے اس سے بولی کہ "اے درخت' تو ہی مجھے چھپا لے۔" اے لو اس درخت کا تو تنا ایک دم چٹاخ سے پھٹا۔ وہ جھٹ پٹ اس تنے میں گھس گئی۔ تنا پھر ویسا کا ویسا ہی۔ اب لکڑ ہاڑے کی سنو۔ اس کے

KitaabPoint.blogspot.com

ایک بیٹا تھا۔ اب وہ جوان ہو چلا تھا۔ باپ نے کہا کہ بیٹا اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ ہلے سے لگو۔ یہ کہہ کے اس نے اسے آری کلہاڑی دی اور کہا جنگل میں جا اور درخت کاٹ۔ لکڑہاڑے کا بیٹا کلہاڑی لے کر جنگل میں نکل گیا۔ دیکھا کہ درختوں میں ایک درخت سب سے اونچا سب سے گھنا ہے۔ بس اس پہ کلہاڑی ماری۔ اندر سے میٹھی سی آواز آئی۔ دھیرے دھیرے۔ پہلے وہ ٹھٹھکا' حیران ہوا۔ خیر ہمت کر کے تنے کو آہستہ آہستہ کاٹنا شروع کیا۔ اندر سے آواز آتی رہی' دھیرے دھیرے۔ جب تنا کٹا تو اے لو اندر سے شہزادی نکلی' چند آفتاب' چندے ماہتاب' لکڑہارے کے بیٹے کا تو نصیبا جاگ اٹھا۔ ''یار جواد'' مجو بھائی کتنی دیر سے کسمسا رہے تھے۔ آخر بولے۔ ''یہ اپنی برکش کتھا بند کرو اور اصلی بات بتاؤ۔''

''اصلی بات؟'' میری بات کٹ گئی تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔''

''ہاں اصلی بات۔ چھپانے کی کوشش مت کرو۔ اصلی بات بتاؤ۔''

''مجو بھائی کونسی اصلی بات؟''

''آخر تم یہ جو اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو صرف درختوں ہی کو دیکھتے رہے۔ یہ سفر تم نے درختوں کے لئے کیا تھا؟''

اس سوال کا میرے پاس واقعی کوئی جواب نہیں تھا۔ آخر یہ سفر میں نے کیوں کیا تھا۔ اتنے زمانے بعد جو میں ادھر گیا تھا تو کیوں گیا تھا۔ بس درختوں کو دیکھنے؟ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس سفر کا مقصد کیا تھا۔ درختوں کا درشن؟ مگر کیا مضائقہ ہے' آخر میں نے سوچا۔ درختوں کے لئے کیا سفر نہیں کیا جا سکتا اور مجھے پھر کہانیاں یاد آنے لگیں۔ بزرگ نے کہا کہ اے جوان عزیز' مجھے تیری جوانی پہ ترس آتا ہے۔ اب بھی وقت ہے لوٹ جا۔ اے بزرگ' سر میں اب یہی سودا سمایا ہے۔ جو ہو سو ہو۔ تو اے' جوان سن' یہاں سے سات سمندر پار ایک گھنا جنگل ہے۔ اس جنگل کے بیچ ایک اونچا گھنا درخت ہے کہ کھکھل میں اس کی ایک اژدھا رہتا ہے اور اس کی سب سے اونچی شاخ میں ایک پنجرا لٹکا ہے۔ پنجرے میں ایک طوطا ہے۔ طوطے میں اس دیو کی جان ہے مگر' اور میرا ذہن یہاں سے اچانک اچٹ کر کہیں اور جا نکلا۔ ابوالحجاج یوسف عجیب بزرگ تھے۔ ایک عمر گزر گئی۔ اور انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ان کے صحن میں ایک کھجور کا پیڑ کھڑا ہے اور اتنا بڑھ پھیل گیا کہ ان کے مریدوں کے لئے ایک مسئلہ بن گیا ہے۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب عبدالرحمن اول کے بوئے ہوئے کھجور کے درخت پر سوا دو سو برس گزر چکے تھے اور اس کے آس پاس کتنے درخت اگ چکے تھے۔ صحرائے عرب کی حور اندلس میں رچ بس چکی تھی۔ اب قرطبہ' اشبیلیہ اور غرناطہ کے گھروں کے صحن اس کا اپنا گھر تھے۔ اور اشبیلیہ میں ابوالحجاج یوسف کے کچے گھر کے کنوئیں سے پانی بھرنے میں بہت دشواری پیش آتی تھی۔ تب

KitaabPoint.blogspot.com

ایک دن ایک مرید نے یوں عرض کی کہ یا شیخ' یہ کھجور اب اتنی پھیل گئی ہے کہ وضو کے لئے کنوئیں سے پانی بھرنا ہمارے لئے ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ شیخ نے مرید کا کلام تعجب سے سنا اور اپنی سفید پلکیں کھول کر سامنے کھڑے کھجور کے گھنے پیڑ کو دیکھا۔ کمال حیرت سے دیر تک اسے دیکھتے رہے۔ لمبے تامل کے بعد زبان کھولی اور یوں گویا ہوئے کہ خدائے واحد کی قسم' میری عمر انہیں در و دیوار کے بیچ بسر ہوئی ہے' مگر میں آج دیکھ رہا ہوں کہ اس صحن میں ایک نخیل بھی ہے۔

یہ کہہ کر شیخ نے آنکھیں موند لیں اور گود میں بیٹھی کالی بلی کو بالوں بھری پشت پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اسی آن قرطبہ سے چل کر آنے والے ایک خدا رسیدہ بزرگ نے دروازے پر دستک دی۔ تسپر وہ بلی شیخ کی گود سے اٹھ کر دروازے پر گئی۔ پچھلے دونوں پنجوں پہ کھڑے ہو کر بزرگ سے گلے ملی۔ تب شیخ بھی اس بزرگ سے اسی محبت سے بغل گیر ہوئے۔

شیخ یوسف عجب تھے۔ بلی سے اتنی الفت اور گھر میں لگی کھجور سے اتنی بے تعلقی' ایک رقیہ تھی کہ اپنے شجر کو دیکھ کر جیتی تھی۔ ام رقیہ قرطبہ میں ابوالمنصور کے محل کی دیوار کے پیچھے اپنے چھوٹے سے گھر میں اپنی کھجور کے ساتھ رہتی تھی۔ والی کا سایہ اٹھ جانے کے بعد اب یہی ایک سایہ اس کے سر پر رہ گیا تھا۔ کن امیدوں کے ساتھ آتے موسم اس کے بارآور ہونے کا انتظار کھینچتی۔ پھر کس شوق سے سبز سے زرد ہوتے اثمار کی دید کرتی اور جب کھجوریں اترتیں تو نہال ہو جاتی۔ مگر ایک دن جب اس پیڑ پر کھجوریں پکنے لگی تھیں ابوالمنصور کے آدمی آ کر عجب حکم سنا گئے کہ ام رقیہ پریشان حال قاضی کے پاس پہنچی اور یوں فریاد کناں ہوئی کہ ''اے قرطبہ کے مبارک شہر کے بزرگ قاضی' تو میرے اور ابن ابی عامر کے بیچ منصفی کر۔''

''منصفی؟ تیرے اور ابوالمنصور کے بیچ؟'' قاضی نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں میرے اور ابی عامر کے بیٹے کے بیچ۔''

''مگر کس باب میں؟''

ام رقیہ نے گریہ کیا اور گلوگیر آواز میں کہا کہ ''اے بزرگ قاضی' ابن ابی عامر کا قلب تنگ اور قصر پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کی ماں اس کے سوگ میں بیٹھے اب میرے گھر کا صحن اس کی زد میں ہے۔ میر عمارت نے قصر کی توسیع کے لئے لازم جانا ہے کہ میرے گھر کی دیوار گرائی جائے اور میری آنکھوں کے نور میری کھجور کو کاٹ دیا جائے۔''

قاضی نے تامل کیا۔ پھر سوال کیا ''اے شریف خاتون' کیا ابوالمنصور کو تیرے صحن کی زمین کے مطلوبہ ٹکڑے کا معاوضہ ادا کرنے میں تامل ہے۔''

KitaabPoint.blogspot.com

اس پر ام رقیہ قدرے برہم ہوئی بولی کہ ''اے منصفی کرنے والے تو نے یہ عجب سوال کیا۔ ابی عامر کا بیٹا میرے صحن کے اس ٹکڑے کی قیمت تو ادا کر دے گا۔ مگر کیا میرے شجر کی بھی کوئی قیمت لگائی جا سکتی ہے۔''

قاضی نے یہ سنا اور سر جھکا لیا۔ وہ لاجواب ہو گیا تھا۔

مگر مجو بھائی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ یا پھر وہ مجھے زچ کرنا چاہتے تھے۔ کہنے لگے ''یار جواد' میں تم سے کیا پوچھ رہا تھا اور تم کدھر نکل گئے۔ اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ وہاں کیا تم اندلس کی تاریخ پڑھنے گئے تھے۔ مگر اندلس کی تاریخ کو تم نے نچوڑ کر نکالا کیا' ایک کالی بلی اور کھجور کا پیڑ۔''

مجو بھائی نے میری ساری بات کو کتنا مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ میں نے زچ ہو کر کہا ''مجو بھائی' میں تاریخ پر بات تو نہیں کر رہا تھا۔''

''اور کیا کر رہے تھے۔ ویسے مجھے تاریخ پر بات کرنے پر فی نفسہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ تاریخ پر بات کرنی ہی ہے تو ایسے بات کرو جیسے تاریخ پر بات کی جاتی ہے۔''

''تاریخ پر کیسے بات کی جاتی ہے' یعنی کہ علامہ بن کر اس پر بات کروں۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''یار' تم تو لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے تو سیدھی سی بات کی تھی' اول تو ہر بات کا موقعہ محل ہوتا ہے۔ اب دیکھو بات ہو رہی تھی اپنے وہاں کی۔ اور اصل بات تم بتا نہیں رہے تھے۔ میں نے تم سے ایک سیدھی سی بات پوچھی۔ تم نے زقند لگائی اور پہنچ گئے اندلس میں۔ اچھا یہی سہی۔ مگر یہ جو تم نے کھجور کے پیڑ پر لا کر تان توڑی ہے' اس میں کیا رمز ہے۔''

''کوئی رمز نہیں۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''ذاتی طور مجھے اس درخت سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہے۔ کبھی نہیں رہی۔ وہ اور درخت ہیں جن سے میری یادیں وابستہ ہیں۔ وہ میرے اپنے درخت ہیں یا کہہ لو کہ تھے۔'' اور یہ کہتے کہتے ایک پورا جنگل میرے تصور میں پھر گیا۔ کیا درخت تھے' ڈراتے بھی تھے' رجھاتے بھی تھے۔ کتنے اونچے کتنے گھنے۔ کھجور کی طرح نہیں جیسے کسی نے لٹھ گاڑ دیا ہو۔ ان کی شان تو یہ تھی کہ جتنے بلند اتنے ہی جھکے ہوئے۔ پروقار بلندی' اسی حساب سے انکساری' ٹہنیوں میں سوا بیچ بیچ' جیسے سبزی اور شادابی تہہ در تہہ ہو۔ بیچ تو پورا شہر آباد ہے۔ رنگا رنگ آوازوں چہچہوں سے گونجتا ہوا۔ یہ درخت دن میں اپنی گھنی چھاؤں کے ساتھ مشفق بزرگ کی مثال کھڑے نظر آتے۔ رات کو لگتا کہ بھوت کھڑے ہیں۔ وہ جو دھرم شالا کے اس طرف پیپل کھڑا تھا وہ تو رات کو بالکل یوں دکھائی دیتا جیسے کالا دیو کھڑا ہے۔ دن میں ایسے لگتا کہ جیسے کوئی رشی کھڑا ہے جیسے سارے نگر پر اس کا سایہ ہے کیتھوں کا درخت بھی کم اونچا نہیں تھا۔ اور پھر کیتھوں سے کتنا لدا رہتا تھا جیسے کیتھیں نہ ہوں کرمچ کی سفید گیندیں ٹہنیوں میں لٹکا دی گئی ہوں۔

KitaabPoint.blogspot.com

اور وہ جو املی کے پیڑ تھے وہ تو سچ مچ آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے تھے۔ آسمان کی نیلاہٹ میں تحلیل ہوتی ہوتی سبز ٹہنیاں' ٹہنیوں میں لہراتی کٹاریں۔ کھجور کے درخت تو وہاں صرف دو تھے۔ وہ جو بھونڑ میں سب درختوں سے الگ کھڑے تھے۔ جیسے یہ سوچ کر خود ہی الگ جا کھڑے ہوئے ہوں کہ ارد گرد کھڑے درختوں کی برادری سے ان کا کوئی ناتا نہیں ہے۔ پرندوں سے بھی کوئی ناتا نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے تو کبھی طوطوں کی کسی ڈار کو ان پر اترتے دیکھا نہیں۔ نہ کبھی کسی بلبل نے ان کی کسی شاخ پہ کوئی گھونسلہ بنایا۔ واقعی غریب الوطن نظر آتے تھے۔ اندلس میں تو وہ غریب الوطن نہیں تھے۔ وہاں تو وہ ایسے رچ بس گئے تھے کہ سارے اندلس پہ چھائے نظر آتے تھے۔ مگر یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک کھڑا تھا۔ اور ایسے پیڑ کہ جڑیں پاتال میں اور پھننگیں آسمان پر۔ یہ پیڑ بھلا انہیں یہاں کیسے چھانے دیتے' نیم' املی' آم' جامن' پیپل اور سب سے بڑھ کر برگد کہ اپنی ذات میں پورا جنگل ہوتا ہے۔ یا ایک پورا شہر' یہی تو برگد کی صفت ہے۔ کبھی جنگل نظر آتا ہے کبھی ایک پورا شہر۔ مگر مجھے جلدی احساس ہو گیا کہ میں بہکنے لگا ہوں۔ یہ میرا اپنا جنگل ہے میں نے سوچا' میں اگر ان درختوں کے بیچ دو قدم اور چلا تو واپسی مشکل ہو جائے گی۔ میں فوراً ہی پلٹ آیا" تو محبوبھائی' بات یہ ہے کہ کھجور کا پیڑ مسئلہ ام رقیہ کا تھا میرا نہیں۔"

"ویسے یار' عبدالرحمن اول نے کھجور کا پیڑ بو کر اچھا نہیں کیا۔ طارق بن زیاد کے سارے منصوبے پہ پانی پھیر دیا۔ واپسی کا رستہ پھر سے کھول دیا۔ ہر کھجور ایک سرنگ تھی کہ اس میں اترو اور اپنے صحرا میں جا نکلو۔"

"ہاں درختوں کی گرفت بہت مضبوط ہوتی ہے۔" یہ کہتے کہتے میں پھر اپنے درختوں میں جا نکلا۔ وہ جو پرانی حویلی کی پرلی طرف پیپل کھڑا تھا وہ کتنا اونچا تھا۔ شاید اپنے نگر کا سب سے اونچا پیڑ وہی تھا۔ اور اس میں پتنگیں کتنی لٹکی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ پیپل نہ ہو پتنگوں کا پیڑ ہو۔ بلندیوں پر جو پتنگ کٹتی تھی وہ اوپر ہی اوپر ڈگمگ کرتی جھکولے کھاتی چلی جاتی تھی۔ اونچے درختوں' اونچی عمارتوں سے بالا بالا' مگر جب اس پیپل کے قریب آتی تو پھر اسے اس پیڑ کو عبور کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ سو بلندیوں میں کٹنے والی ہر پتنگ جو اس راہ سے گزرتی وہ اس پیپل میں آ کر الجھ جاتی اور رفتہ رفتہ ٹہنیوں پتوں کے ساتھ اتنی گھل مل جاتی کہ لگتا کہ انہیں کے بیچ سے پھوٹی ہے۔ بلندیوں میں اڑنے والی کسی چیل کا بھی جب سستانے کو جی چاہتا تو تھوڑا نیچے اتر کر اسی کی کسی پھننگ پر اتر کر ٹک جاتی اور اس طرح تکتی جیسے اب یہاں سے نہیں اڑے گی۔ پھر کوئی فاختہ دور سے اڑتی آتی اور وہ بھی یہاں آ کر اس اطمینان سے آ کر بیٹھتی جیسے یہ اس کا آخری پڑاؤ ہے۔ اس کے اطمینان کی تو شاید یہ وجہ تھی کہ کسی غلیل سے نکلنے والا کوئی غلہ مشکل ہی سے اس پیپل کی اونچی پھننگ تک پہنچ سکتا تھا۔

KitaabPoint.blogspot.com

مگر مجو بھائی کو ان قصوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مجھ سے کچھ اور ہی اگلوانا چاہتے تھے۔ مگر میرے پاس کچھ اگلنے کے لئے ہوتا تو میں اگلتا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں جان کر ان سے کچھ چھپا رہا ہوں۔ ''یار تم کچھ چھپا رہے ہو۔ آخر پتہ تو چلنا چاہیے کہ اصلی بات کیا تھی۔'' اور یہ فقرہ انہوں نے اتنی بار کہا کہ آخر میں بھی شک میں پڑ گیا کہ آخر اصلی بات تھی کیا۔ اور یہ کہ کیا میں بیچ میں سے کچھ بھول گیا ہوں۔ اور جب میں نے یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ اصلی بات کیا تھی تو کتنا کچھ یاد آتا چلا گیا۔ یادوں کے انبار لگ گئے۔ لیجئے کیا بات یاد آئی۔ یہ ان دونوں کی بات ہے جب میری عمر ابھی..... اب کہاں یاد ہے کہ اس وقت میری عمر کیا تھی بچپن میں آدمی عمر کے متعلق کہاں سوچتا ہے۔ اور سوچتا بھی ہے تو یہ کہ جلدی سے بڑا ہو جاؤں۔ اچھا خیر۔ کیا بات یاد آئی تھی۔ ہاں وہ جو ہماری پرانی حویلی تھی اس کے عین سامنے ایک دکان تھی جہاں آتے جاتوں ایک دھنیا بیٹھتا تھا۔ کیا مجال کہ ادھر ادھر دیکھے۔ اپنی دھن میں مگن روئی دھنکتا رہتا تھا۔ راچھ مستقل چل رہی ہے۔ تانت بج رہی ہے اور دھنکی ہوئی روئی کا ڈھیر لگتا چلا جا رہا ہے۔ اس دھنکنے میں روئی کے گالے اتنے اڑتے کہ اوپر سے نیچے تک ساری دکان سفید سفید گالوں سے اڑتی نظر آتی۔ خود وہ دھنیا ان گالوں کی گرد میں سفید سفید نظر آتا' جیسے گوشت پوست کا نہیں' روئی کی گرد سے بنا آدمی ہو۔ میں کتنی کتنی دیر تک اپنی ڈیوڑھی میں کھڑا اسے تکتا رہتا۔ کتنی حیرت ہوتی تھی اسے دیکھ کر' مگر اب تو میں خود ویسا ہی بن گیا تھا۔ میں یادوں کا دھنیا بن چکا تھا۔ کب کب کی کہاں کہاں کی یادوں کا انبار لگا ہوا تھا اور میں انہیں دھنک رہا تھا۔

''یار تم بیمار آدمی ہو۔'' مجو بھائی نے بال آخر میرے اس مشغلہ سے تنگ آ کر کہا۔ ''مجو بھائی' آپ کو یاد ہے کہ جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی اور مجھ سے آپ نے پوچھا تھا کہ اماں کہاں کے رہنے والے ہو تو میں نے کیا جواب دیا تھا۔'' ''استاد' ہر بات یاد رکھنے کے لئے نہیں ہوتی۔''

مجو بھائی بھول گئے تھے۔ مجھے وہ بات یاد تھی۔ وہ میری خود فراموشی کا زمانہ تھا۔ شاید وہی اچھا زمانہ تھا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اس شہر میں میرا دن کافی ہاؤس میں اور رات جگی میں بسر ہوتی تھی۔ اپنی بستی' اپنا گھر' اپنا خاندان سب کچھ اچانک ماضی بن گیا تھا۔ جو پیچھے رہ گیا سو ماضی' سو اس سے رشتہ القط' اور سب ہی کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ بس خالی اپنے وجود کو لئے میں اس شہر میں پھر رہا تھا۔ دن بھر مارے مارے پھرنا' شام پڑے رات گئے پھر اپنی جگی میں مگر جگی بھی تو قسمت والوں کو ملتی تھی۔ مجھے ایسے ہی تھوڑا ہی مل گئی تھی۔ میں تو سٹیشن پہ پڑا تھا اور بے ٹھکانہ پھر رہا تھا۔ کہیں مصباح سے میری مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ عجب زمانہ تھا وہ۔ اجنبی شہر میں پھرتے پھراتے ایسے ہی کوئی آشنا چہرہ نظر آ جاتا۔

KitaabPoint.blogspot.com

''ارے تم؟ کب آئے۔ کیسے پہنچے۔ کونسی سپیشل سے؟ حملہ تو نہیں ہوا تھا۔'' ایک دم سے اتنے بہت سے سوال۔ ملنے والے کو صحیح و سالم دیکھ کر کتنی حیرت ہوتی اور کتنی خوشی۔ پھر تھوڑی سی رقت' تھوڑا بے سروسامانی کا تذکرہ۔ اس حد تک ایک دوسرے سے ملنا کتنا اچھا لگتا تھا۔ بچھڑے ہوئے اس حد تک خلوص سے ملتے تھے۔ مگر جب درمیان میں تھوڑی مدد اور سہارے کا سوال آ جاتا تو پھر اسی تیزی سے یار ایک دوسرے سے کنی کاٹ جاتے۔ کون کس کی مدد کرتا۔ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ مگر مصباح دوسرے مزاج کا نکلا۔ اصل میں ہم دونوں کا کالج میں ساتھ رہا تھا اور ایک گروپ تھا۔ لاہور تک کا پرخطر سفر اکٹھے گیا۔ لاہور سٹیشن پر اتر کر تتر بتر ہو گئے۔ جس کی جدھر سینگ سمائے ادھر نکل گیا۔ گھوم پھر کر خواری کے بعد سب ہی کراچی پہنچ گئے۔ مگر اب ہم سب ایک دوسرے سے بے تعلق اور بے خبر تھے۔ مصباح ایک روز اچانک دکھائی دیا۔ ٹریم میں ہماری مڈھ بھیڑ ہوئی۔ ''ارے جواد تم۔'' میں نے پلٹ کر دیکھا تو مصباح تھا۔ کتنے خوش ہوئے ہم ایک دوسرے سے مل کر۔ اور ایک دم سے ہم نے ایک دوسرے سے کتنے سوال پوچھ ڈالے اور دوسرے کو کتنا کچھ بتا ڈالا۔

''اچھا یہ بتاؤ' کیا کر رہے ہو۔'' مصباح نے پوچھا۔

''فی الحال کچھ نہیں۔''

''کہاں رہتے ہو؟''

''کہیں بھی نہیں۔''

''کیا؟''

''ہاں بے ٹھکانہ ہوں۔''

''اچھا۔'' رکا۔ پھر بولا ''میری جھگی میں آ جاؤ۔ اکیلا ہوں' ایک سے دو ہو جائیں گے۔ بستر تو ہے نا؟''

''ہاں بستر تو ہے۔''

''پھر ٹھیک ہے۔ کام چل جائے گا۔''

تو میں مصباح کے ساتھ جھگی میں رہنے لگا۔ اردگرد کتنی جھگیاں تھیں۔ کیسا کیسا اینٹھے خاں' جنٹلمین' چھیل چھکنیا' طرم باز' رئیس زادہ' شائستہ طبع' نفاست پسند' خوش پوش' کج کلاہ' ان جھگیوں میں گزارہ کر رہا تھا۔ جھگی پر قبضہ کے لئے کیسے کیسے جتن کرنے پڑتے تھے اور کیا کیا لڑائیاں ہوتی تھیں۔ جو جھگی پر قابض ہو جاتا جانتا کہ اس نے ملک فتح کر لیا۔ وہ جھگی کال تھا' اور اس کے بطن میں ایک نیا

KitaabPoint.blogspot.com

زمانہ کلبلا رہا تھا۔ فلیٹوں' کوٹھیوں' پلازاؤں کا زمانہ' تو یہ اسی زمانے کی بات ہے۔ یا شاید اس کے بعد تھوڑے دنوں بعد کی۔ کیونکہ وہ زمانہ لمبا تو نہیں کھنچا تھا۔ بہت ہی زٹیل ہوں گے کہ جھگیوں میں پڑے رہ گئے۔ ورنہ یاروں نے دیکھتے دیکھتے آسمان میں تھگلی لگائی اور مقامات بلند کو جا چھوا۔ تو جھگیوں کا زمانہ مختصر تھا۔ مگر اس میں کتنا کچھ پوشیدہ تھا۔ کتنے امکانات اس کی تہہ میں تھرتھرا رہے تھے۔ کوئی کوئی زمانہ ہوتا تو ہے مختصر مگر لگتا ہے کہ وہ ایک پورا عہد تھا۔ تو جھگیوں کا زمانہ دیکھنے میں مختصر تھا مگر وہ ایک عہد ساز دور تھا۔ اور اگر مجو بھائی کی بات مان لی جائے تو کراچی کا اصلی زمانہ وہی تھا۔ ''پیارے یہ جو آج کا کراچی ہے وہ تو جھگیوں کے خمیر سے اٹھا ہے۔''

''سبحان اللہ'' میں ہنس پڑا۔

''ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ جو ایرا غیرا اپنے آپ کو کراچی والا بتانے لگتے ہیں ان پر مت جاؤ۔ اصلی کراچی والا وہ ہے جس نے جھگی میں بسر کی ہے۔''

''جو پرانے کراچی والے ہیں وہ تو کراچی والے نہ ہوئے۔''

''یار جواد' یہ تمہاری بہت بری عادت ہے۔ ہتھے پہ ٹوک دیتے ہو۔ میں تو تازہ واردان بساط ہوائے دل کی بات کر رہا ہوں۔ چار دن کراچی میں رہتے ہیں۔ پانچویں دن کراچی والے بن جاتے ہیں۔''

''مجو بھائی' اس میں کچھ کراچی کا بھی قصور ہوگا۔ لاہور میں تو کوئی چار دن رہ کر لاہوریا نہیں بن سکتا۔ اور دلی جو ایک شہر تھا وہاں باہر آنے والوں کی نسلیں گزر جاتی تھیں اور دلی والے انہیں دلی والا مان کر نہیں دیتے تھے۔ تو آپ آدمی کی جڑیں شہر میں تلاش کرتے ہیں۔ مگر شہر کی اپنی بھی تو جڑیں ہونی چاہئیں۔

''اماں باوا لے ہوئے ہو۔ سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہر کی کہیں جڑیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ تو پانی پہ تیرتا ہے۔''

بہر حال میرے کراچی والا ہونے سے تو مجو بھائی انکار نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے تو جھگی میں بسر کی تھی اور اگر مجو بھائی مجھے ورغلاتے تو پتہ نہیں کتنے دنوں اور جھگی میں بسر کرتا۔ مصباح تو اپنے صاحب رسوخ عزیزوں کے آجانے کے بعد جلدی ہی وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں اس جھگی کا بلا شرکت غیرے مالک بن گیا تھا۔ ایسے وقت میں جب خلقت کو پاؤں ٹکانے اور سر چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ ایک عدد جھگی میری ملکیت میں تھی۔ میں جھگی میں رہتا عرش میں جھولتا تھا۔ لگتا تھا کہ میں اس شہر میں جڑ پکڑ رہا ہوں۔ مگر مجو بھائی نے مجھے وہاں سے اکھاڑ دیا۔ مجو بھائی سے انہیں دنوں میری مڈھ بھیڑ کافی ہاؤس میں ہوئی تھی۔ پتلی موری والا پائجامہ' بو والا کالا پمپ' بر میں علی گڑھ کٹ سیاہ شیروانی' سر پہ ترچھی ٹوپی رامپور والی' کیسے بانکے نظر آ رہے تھے۔

KitaabPoint.blogspot.com

کئی شاعر ارد گرد اکٹھے تھے' کوئی امروہوی' کوئی بدایونی' کوئی گلاوٹھوی' کوئی اسٹھوی' کافی چل رہی تھی اور غزل پر گفتگو۔ میں اپنی نئی نئی اشلکچولزم کے زور میں ان سے بھڑ گیا۔ بیچارے غزل گو تھے۔ بحث کیا کرتے مجو بھائی خاموش سگریٹ پیتے رہے' مجھے دیکھتے رہے۔ دیر بعد بولے "اماں یہ بحث پھر کبھی کے لئے اٹھا رکھو۔ اس وقت تو تم ہمیں اپنے شعر سناؤ۔"

"شعر تو میں نہیں کہتا۔"

"شعر نہیں کہتے؟ گویا خالی اشلکچوئل بحثوں پہ گزارہ ہے۔"

"جی معاف کیجئے' میں شاعری پڑھتا ہوں' کرتا نہیں۔"

"پھر کرتے کیا ہو۔"

"کچھ نہیں۔"

"ٹھکانا؟"

"کہیں نہیں۔"

"کب وارد ہوئے اس شہر میں۔"

"انہیں دنوں۔"

"اکیلے آئے ہو یا....."

"اکیلا۔"

"کس شہر سے وارد ہوئے ہو۔"

"جو بھی شہر تھا پیچھے رہ گیا۔ اب تو اسی شہر میں ہوں۔"

"صاحبزادے' یہ شہر ناپرساں ہے۔"

"جانتا ہوں۔"

"ابھی کہاں جانا ہے۔ جانو گے۔ ویسے رات کو کہیں تو سر چھپاتے ہو گے۔"

"جھگی میں بسیرا کرتا ہوں۔"

"تو یوں کہو' جھگی والے ہو۔"

KitaabPoint.blogspot.com

لیجئے اس روز سے میں جواد سے جواد جھگی والا بن گیا۔ کوئی پوچھتا کہ کون جواد' یاروں کی طرف سے جواب ملتا۔ جواد جھگی والا۔ میں زچ ہو گیا۔ تب مجو بھائی تھوڑے نرم پڑے "اماں یہ کیا تم نے جھگی کا دم چھلا اپنے ساتھ لگا رکھا ہے۔" "میں نے لگا رکھا ہے۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔

"میاں آخر کب تک وہاں پڑے رہو گے۔ لعنت بھیجو اس جھگی پہ۔"

"پھر کہاں جاؤں' سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ ہے۔"

"اماں یوں کرو کہ بستر بوریا لے کے تم میری طرف آ جاؤ۔ ہم بھی چھڑے تم بھی چھڑے۔ خوب گزرے گی۔"

نیکی اور پوچھ پوچھ۔ جھٹ پٹ جھگی کی زندگی کو سلام کیا۔ بستر بوریا باندھا اس خرابے سے نکل مجو بھائی کے ٹھکانے پہ پہنچا اور وہاں پسر گیا۔

ساتھ آ کر رہا تو جانا کہ مجو بھائی کیا شئے ہیں۔ ویسے تو ٹیم ٹام بہت تھی۔ کس ٹھسے سے کافی ہاؤس میں بیٹھتے تھے۔ کیا مجال تھی کہ ناک پہ مکھی بیٹھ جائے۔ مگر استاد بیچ میں سے پھانک نکلے۔ اتوار کا دن تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے پلنگ پہ پڑے اینڈ رہے تھے۔ اچانک انہوں نے جھرجھری لی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے "اماں' کافی ہاؤس نہیں چلنا' یا اتوار کا سارا دن اینڈ اینڈ کر ہی گزارو گے۔

"ہاں چلنا تو چاہیے۔ آج تو زیادہ ہی جھمگٹا ہو گا۔"

"پھر ہے چونی اٹھنی' بس کا کرایہ تو جیب میں ہونا ہی چاہیے۔"

میں نے جیب ٹٹولی۔ "ہاں اتنا تو نکل آئے گا۔ مگر کافی' سگریٹ' پان' اس کے لئے بھی تو جیب میں کچھ پیسہ دھیلا ہونا چاہیے۔" "اماں اس کی بھلی فکر کی۔ بس کافی ہاؤس تک پہنچنا شرط ہے۔"

بس ہم فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

مجو بھائی چھڑے چھانٹ' فکر معاش سے آزاد مگر خدا مسبب الاسباب تھا۔ جیب کبھی بھاری کبھی خالی۔ مگر ان کی خالی جیب کا علم تو صرف مجھے ہوتا تھا۔ کافی ہاؤس میں بیٹھی ہوئی ٹولیوں کے تو فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں ہوئی۔ روز کو نسا بل ادا کرتے تھے۔ مہینے دو مہینے میں جب جیب بھاری ہوئی حساب چکا دیا۔ بلکہ کڑاکے کے دنوں میں تو پان سگریٹ' ٹیکسی کا کرایہ' یہ سارا حساب دین محمد ویڑ کے ذمے ہوتا تھا۔ سواری کا معاملہ یہ تھا کہ جب جیب بھاری سے ہلکی ہونے لگتی تو مجو بھائی پھر ٹیکسی کو چھوڑ کر بس پر آ جاتے۔ مگر جیب بالکل خالی ہو جاتی تو پھر ٹیکسی ہی سے رجوع کرتے۔ ٹیکسی کافی ہاؤس کے سامنے جا کر رکتی اور دین محمد آ کر اس کی ادائیگی کرتا۔ ایک

KitaabPoint.blogspot.com

مرتبہ ہاتھ کشادہ ہوا تو انہوں نے دوسری عیاشیوں کی ساتھ ایک عیاشی سائیکل خریدنے کی بھی کر ڈالی۔ اور مجھے مژدہ سنایا ''لو بھائی میں نے بسوں' ٹیکسیوں کے جھمیلے سے تو چھٹکارے کی صورت پیدا کر لی۔ سائیکل خرید لی ہے۔''

''مجو بھائی' یہ آپ نے اچھا کیا۔ کنوینس کی پریشانی تو ختم ہوئی۔''

مگر مجو بھائی زیادہ عرصے تک سائیکل کے ساتھ نباہ نہیں کر سکے۔ تنگی کا پیریڈ شروع ہوا تو انہوں نے مجھے قائل کرنا شروع کیا ''جواد' خیر سے تمہیں نوکری مل گئی ہے۔ مگر یار صبح کو سواری ملنی بڑی مشکل ہوتی ہے۔''

''ہاں مجو بھائی' وہ تو ہے۔ صبح کو بسیں بھری ہوئی چلتی ہیں۔ بہت رش ہوتا ہے' اور ٹیکسی روز تو نہیں کی جا سکتی۔ اور ٹیکسی بھی ان اوقات میں کہاں ملتی ہے۔''

''مجھے اس کا اندازہ ہے۔ یار ایسا کرو کہ ایک سائیکل خرید لو۔''

''مجو بھائی' سائیکل پوری ایک تنخواہ لے جائے گی۔''

''یار سکینڈ ہینڈ خرید و۔ ایک مہینہ تنگی ترشی میں گزرے گا۔ مگر اس سے آرام کتنا ہو جائے گا۔''

بات دل کو لگتی تھی۔ میں قائل ہو گیا۔ کئی سیکنڈ ہینڈ سائیکلیں دیکھیں' کوئی جچی نہیں۔ مجو بھائی بولے ''یار چھوڑو اس کے چکر کو۔ تم میری سائیکل لے لو۔ میں نے تو سائیکل خرید کر تکلف ہی کیا۔ مجھ سے یہ سواری کھنچتی نہیں۔''

تو مجو بھائی نے اپنی سائیکل میرے سر منڈھ کر دام کھرے کر لئے۔ اور چند دنوں کے لئے امیر بن گئے۔ پہلے میں ان کے پیچھے کیریئر پر بیٹھ کر کافی ہاؤس جاتا تھا۔ اب وہ میرے پیچھے کیریئر پر بیٹھ کر کافی ہاؤس جانے لگے۔ مگر یہ سنگت بھی زیادہ دن نہیں چلی۔ تنگی ترشی کا دور جب پھر شروع ہوا تو کہنے لگے کہ ''یار' اپنا وہ اپنا پہلا ہی ٹھکانا جیسا بھی تھا اچھا تھا۔ یہ مکان کرائے پر لے کر تو ہم مشکل میں پڑ گئے۔ مکان دار بہت ذلیل ہے۔ کرایہ جب تک وصول نہیں کر لے گا۔ جینے نہیں دے گا۔ اور ادھر اپنا ہاتھ ان دنوں بہت تنگ جا رہا ہے۔''

واقعی پریشانی کی بات تو تھی۔ میں نے کہا ''مجو بھائی' ادھر میرا معاملہ بھی یہ ہے کہ تنخواہ سب ختم کر بیٹھا اور پہلی ابھی دور ہے۔''

''پھر کیا کیا جائے۔ مجو بھائی سوچ میں ڈوب گئے۔

''بس یہی ہو سکتا ہے کہ میں اپنی سائیکل بیچ دوں۔'' یونہی میرے منہ سے نکل گیا۔

''نہیں یار۔ پھر تم دفتر کیسے جاؤ گے۔''

KitaabPoint.blogspot.com

''جیسے پہلے جاتا تھا۔''

''نہیں یار۔'' مجو بھائی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ مگر دوسرے تیسرے ہی دن انہوں نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔ ''یار جواد ایک بھلا مانس میرے گلے پڑ گیا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے کوئی اچھی سی سیکینڈ ہینڈ سائیکل دلوا دو۔ میں تو کہتا ہوں کہ اچھا موقع ہے۔ اس سائیکل کے ٹائر تو ویسے ہی جواب دے گئے ہیں اچھے پیسے مل جائیں گے۔ پیسے کھرے کرو اور اس جنجال سے پیچھا چھڑاؤ۔''

پہلے میں نے ہچر مچر کی۔ مگر مجو بھائی نے مجھے قائل کر ہی لیا۔ تو سائیکل بیچ کھوچ کر مکان کا کرایہ ادا کیا۔ تھوڑا حساب دین محمد کا صاف کیا اور ہم دونوں پھر پیدل کے پیدل۔ ویسے تو خوشحالی کا دور پھر جلدی ہی آ گیا۔ مختصر مدت ہی کے لئے سہی مگر آیا اور ایسا آیا کہ مجو بھائی ایک ایک کی جگہ چار چار خرچ کرنے لگے۔ کافی کے آرڈر بھی زیادہ دیئے جا رہے تھے کہ نیاز مندوں کا حلقہ اچانک زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ مگر مجو بھائی اپنی سواری کے خیال سے تائب ہو چکے تھے۔ اس لئے دوبارہ سائیکل خریدنے کا خیال انہیں سرے سے آیا ہی نہیں۔ اب ایک دوسرا ہی مسئلہ انہیں پریشان کر رہا تھا۔ کہنے لگے ''یار بازار کا کھانا کب تک کھائیں۔ ہوٹل کا کھانا بھی سالا کوئی کھانا ہوتا ہے۔''

''پھر کیا ہو سکتا ہے مجو بھائی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ جو شاعرات ہیں اور آپ کے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں ان میں سے کل کلاں کو کوئی دانہ آپ کے نکاح میں آ کر اس گھر کی زینت بن جائے۔ پھر ہوٹل کے کھانے سے نجات مل سکتی ہے۔''

مجو بھائی نے مجھے شک بھری نظروں سے دیکھا۔ ''میرے نکاح میں یا تمہارے نکاح میں۔'' رک کر بولے ''جواد میاں' یہ سب حرافائیں ہیں۔ ایسا خیال بھی دل میں نہ لانا۔'' پھر تھم کر بولے۔ ''میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔''

''کیا؟''

''یار خانساماں نہ رکھ لیں؟''

اب میر چونکنے اور حیران ہونے کی باری تھی ''خانساماں؟ کیا کہہ رہے ہو مجو بھائی رکھنا تو گھر پہ ہاتھی باندھنے کے مترادف ہے۔''

''ہاں بھئی یہ تو ہے۔ مگر جواد جو سالے کاروں پہ بیٹھ کر کافی ہاؤس آتے ہیں اور جن کی بیگمات کسی نہ کسی بہانے اپنے خانساماں کا ذکر ضرور کرتی ہیں تو کیا یہ لوگ بہت اینٹھے خاں ہیں۔ اور ہم کیا کسی سے پتلا موتتے ہیں۔''

میں نے تامل کیا۔ پھر جھجکتے ہوئے کہا ''مجو بھائی' میری کتنی تنخواہ ہے' یہ تو آپ کو پتہ ہی ہے۔''

''لاحول ولا قوۃ..... تم مجھے اتنا گھٹیا آدمی سمجھتے ہو۔ میں خانساماں کی تنخواہ تم سے دلواؤں گا۔ تو بھائی اب تو خانساماں ضرور رکھا

KitaabPoint.blogspot.com

جائے گا۔"

اور واقعی چند دنوں ہی میں ایک بھلا سا خانساماں اس مختصر سے گھر میں جس میں ہم اب آ کر رہے تھے آن موجود ہوا۔ گھر میں ایک ڈائننگ ٹیبل بھی آ گئی۔ اور ساتھ ہی نئی کراکری بھی۔ تو چند دن گھر میں خوب امی جمی رہی۔ ڈائننگ ٹیبل پر روز ایک نئی ڈش ہوتی۔ اور اتوار کی دوپہر کو تو ڈشوں کی بہار ہوتی۔ ہم دونوں تو بالالتزام گھر پہ ہوتے ہی تھے۔ مجو بھائی کے چیلے چانٹوں میں سے ایک دو آن ٹپکتے تھے۔

ویسے یہ زمانہ لمبا نہیں کھنچا۔ مجو بھائی کی تو ہتھیلی میں چھید تھا۔ رقم جو مجو بھائی کی مٹھی میں غیب سے آئی تھی اگر وافر بھی تھی تو کتنے دن ٹک سکتی تھی۔ تو جیب جلدی ہی بھاری سے ہلکی ہونے لگی۔ اور مجو بھائی نے جلدی ہی یہ جتانا شروع کر دیا کہ مرغن غذاؤں سے ان کا جی بھر گیا ہے۔ "یار روز گوشت..... حد ہے۔ بھلے آدمیوں کی اتنا تو مسلمان نہیں ہونا چاہیے۔" اور فوراً ہی انہوں نے خانساماں کو ہدایت کی۔ "خانساماں یہ مرغی ورغی کا چکر چھوڑو۔ روز وہی ایک ڈش۔"

"جی بکری کا گوشت لے آؤں۔"

"نہیں بھائی' گوشت بہت ہو گیا۔ کچھ دال ترکاری پکاؤ۔ آج تو یوں کرو کہ مسور کی دال پکالو۔ آخر دال بھی تو کھانی چاہیے۔"

مسور کی دال ایسی پکی کہ پھر سات دن تک وہی ہنڈیا پکتی چلی گئی۔ اور جب اتوار کا دن آیا تو مجو بھائی نے خانساماں سے کہا کہ آج ہم مرغشت کے لئے نکل رہے ہیں۔ باہر ہی کھانا کھائیں گے۔ تم اپنے لئے کچھ دال دلیا کر لینا۔

اس دوپہر کو مجو بھائی نے کافی ہاؤس میں کافی کے ساتھ ایک آملیٹ اور چھ سلائس کا آرڈر دیا۔ یوں ہماری پیٹ پوجا کا انتظام ہوا۔ ادھر خانساماں نے بھی اب ہماری اوقات کو جان لیا تھا۔ بس دوسرے تیسرے دن ہی اس نے مجو بھائی کو سلام کر لیا اور مہینے کی پہلی تنخواہ کی ادائیگی کا وعدہ لے کر رخصت ہو گیا۔ اور مجو بھائی نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ "یار یہ خانساماں بھی جھمیلا ہی ہوتا ہے۔ ہم جیسے چھڑی چھانٹ مخلوق کے بس کا یہ کاروبار نہیں ہے۔ چلا گیا۔ اچھا ہوا۔"

پھر وہی پچھلا معمول۔ مجو بھائی صبح ہی صبح اٹھ کر چائے بناتے۔ سلائس سینکتے' مجھے پکارتے "جواد میاں آ جاؤ۔ جلدی کرو' تمہارے دفتر کا وقت ہو رہا ہے۔" اور جب آ کر ناشتہ کرنے لگتا تو دلاسہ دیتے "یار رات میں انڈے لانا بھول گیا۔ سالا مکھن بھی ختم ہو گیا۔ چلو آج تو گزارہ کر لو۔ جو بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے مجو بھائی' ناشتہ تو سادہ ہونا چاہیے۔ ویسے میں آج دفتر سے واپس آتے ہوئے کچھ انڈے اور مکھن کی ٹکیا لیتا آؤں

KitaabPoint.blogspot.com

گا۔"

"اچھا یار۔ بہت سخی بن رہے ہو۔ اچھا چلو یوں ہی سہی۔"

بس اس طور زندگی گزر رہی تھی۔ مجو بھائی کبھی دھنا سیٹھ کبھی پھانک' ہاں پھانک ہونا تو سمجھ میں آتا ہے مگر وہ دھنا سیٹھ کیسے بن جاتے تھے' کسی پہ یہ راز کبھی کھلا نہیں۔ کام کے نام تو مجو بھائی نے کبھی پتہ نہیں ہلایا۔ ہمارے دور کے رشتے سے ایک خالو جان تھے۔ کام دھام کچھ نہیں کرتے تھے۔ نوکری چاکری سے بے نیاز' نہ زمینداری نہ دکانداری۔ مگر خالہ اماں کہا کرتی تھیں کہ "بی بی' اللہ کا فضل ہے۔ ہم دونوں وقت گوشت روٹی کھاتے ہیں۔ اور گوشت بھی بکری کا۔ ہاں کبھی کبھی اچھن کے ابا اپنے شوق سے خاص طور پر بنوا کے گائے کا گوشت لے آتے ہیں۔ میں بگڑتی ہوں کہ گائے کا گوشت ہمارے گھر میں کیوں آیا تو کہتے ہیں کہ اچھن کی ماں آج گینی گائے ہوئی تھی تو میں نے سوچا کہ سینے کا گوشت بنوالوں۔ مولی کے ساتھ اس کا ذائقہ نکلتا ہے۔ تو آج مولی گوشت پکاؤ۔"

سننے والیاں سنتیں اور چندرا چندرا کر کہتیں کہ "نگوڑا گھی دو روپے سیر ہو گیا اور آٹا اب روپے کا سولہ سیر مل رہا ہے۔ شرفاء کے لئے گزارہ مشکل ہو رہا ہے۔ خالو جان کمانے نہ دھمانے' خالہ اماں کیسے دونوں وقت گوشت روٹی کھا لیوے ہیں۔"

پھر معمہ یوں سلجھایا جاتا کہ "خالو جان نے جلالی وظیفہ پڑھا تھا۔ ان کے موکل رات کو آوے ہیں۔ صبح کو اٹھ کے جب وہ تکیہ اٹھاوے ہیں تو اس کے نیچے سے دو چاندی کے روپے نکلے ہیں۔"

مجو بھائی کی شہرت بھی ان دنوں رفتہ رفتہ کچھ اسی قسم کا رنگ پکڑتی چلی گئی۔ نئے زمانے کے نئے وظیفے نئے جن۔ اغیار نے پہلے آپس میں سرگوشیاں کیں کہ مجو بھائی کا کوئی ذریعہ روزگار تو ہے نہیں۔ مگر رہتے ہیں ٹھاٹ باٹ سے۔ اور کیا للے تللے ہیں کہ ادھر ٹکٹری میز پہ آئی ادھر کافی کا آرڈر دیا گیا۔ ایک ٹکڑی' دوسری ٹکڑی' تیسری ٹکڑی' اور کافی ہے کہ آئے چلی جا رہی ہے۔ آخر یہ چکر کیا ہے؟ کانا پھوسی' پھر شک بھرے سوالات' پھر انکشاف کہ یہ غیبی کمائی کا کرشمہ ہے۔

"آخر مجو بھائی جو وقت بے وقت کافی ہاؤس میں پائے جاتے ہیں تو اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔"

"یار' میں تو اس پہ حیران ہوں کہ ہم کافی ہاؤس میں بیٹھ کر جو بات کرتے ہیں اس کی خبر دوسرے دن کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ آخر ہمیں میں سے کوئی پہنچاتا ہوگا۔"

"ہاں ہمیں میں سے کوئی ہونا چاہیے۔"

معنی خیز خاموشی' کوئی اڑتا سا اشارہ۔ کسی کا کچھ کہنے لگنا اور کہتے کہتے بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو جانا۔ پھر کسی کا ٹھنڈا سانس

KitaabPoint.blogspot.com

بھرنا اور اپنے حال پر افسوس کرنا" یار ہم تو کنوئیں کے مینڈک ہیں۔ کافی ہاؤس کے ساتھ چپک کر رہ گئے ہیں۔"

"یار کافی ہاؤس میں بیٹھنے کا یہ مطلب تو نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی اپنے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جائے۔ یہ آخر مجو بھائی بھی تو ہیں۔"

"یار واقعی۔ ابھی پچھلے ہفتے کی بات ہے۔ ایک میرے دوست نے کہا کہ کیا یار کافی ہاؤس میں بیٹھے رہتے ہو۔ چلو میرے ساتھ۔ دیکھو میں تمہیں کیسے بڑے بڑے آدمیوں سے ملاتا ہوں۔ وہ مجھے ڈنر پر لے گیا کسی بزنس مین کی طرف سے تھا۔ کھانے کے ساتھ محفل موسیقی بھی تھی۔ شہر کی بڑی بڑی شخصیت رونق افروز تھی۔ افسر حضرات معہ بیگمات کے بیچ میں اپنے مجو بھائی بھی دھرے ہوئے تھے۔"

"واقعی؟"

"واقعی' ہمیں تو انہیں نے گھاس ڈالی نہیں۔ افسروں کے بیچ میں گھسے ہوئے تھے۔ کتنی دیر تک کمشنر صاحب کے ساتھ چپکے رہے۔ بڑی راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں۔"

"خوب۔"

"بڑی شئے ہیں اپنے مجو بھائی۔"

اصل میں مجو بھائی نے اپنے دشمن بھی تو اچھے خاصے پیدا کر لئے تھے۔ کچھ انہوں نے اپنی خرد ماغی سے پیدا کئے۔ کچھ بوجوہ پیدا ہوتے چلے گئے۔ بیٹھے بیٹھے کیا سوجھی کہ اعلان کر دیا کہ ہماری محفل میں شریک ہونے والے شاعروں کے لئے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ پڑھے لکھے ہونے کی وضاحت چاہی گئی تو کہا کہ کم از کم بی اے تو ہو۔ میں نے اس وقت ٹوکا بھی "مجو بھائی' یہ آپ نے عجیب شرط لگائی ہے۔ کیا شاعر کے لئے گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔"

بولے "اماں' تم نہیں سمجھتے۔ اس طرح للوؤں پنجوؤں سے تو نجات ملے گی۔"

ہاں کسی حد تک نجات ملی تو سہی۔ لیکن جن سے نجات ملی انہوں نے باتیں بنانی شروع کر دیں۔ پھر حلقہ میں شامل شاعروں میں سے جس کسی کو بھی احساس ہوا کہ مجو بھائی نے مشاعرے والوں سے اس کی شفارش نہیں کی اس نے بھی در پردہ اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ مجو بھائی بیشک شاعر نہ ہوں (اگرچہ یقین سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔) مگر شاعروں کے استاد اور مربی بنے بیٹھے تھے۔ شاعروں سے آگے ریڈیو کے پروگراموں کے لئے بھی ان کی سفارش چلتی تھی۔ ان کے نیاز مند تو وہاں بھی موجود تھے۔ اور شاعری کا معاملہ بھی یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ انہوں نے بہت کہا' مگر کبھی سنایا نہیں۔ بلکہ کبھی کسی کو اپنے شاعر ہونے کی ہوا ہی نہیں دی۔

KitaabPoint.blogspot.com

ویسے اس میں شک نہیں کہ مجو بھائی کی رسائی تھی دور دور تک۔ افسروں پہ موقوف نہیں' ہر طرح کی شخصیت سے ربط وضبط تھا اور ایسا ویسا ربط وضبط' خاندانوں کے اندر گھسے ہوئے تھے۔ لکھنو اور دلی تو خیر ہوئے مگر وہاں تو یہ عالم تھا کہ یوپی کے کسی مرے گرے قصبے سے بھی کوئی صاحب حیثیت خاندان ہجرت کر کے اس شہر میں آن پہنچا تو بس ہفتے عشرے میں مجو بھائی اس کے جملہ کوائف معلوم کر لیتے اور پھر اس خاندان کا شجرۂ نسب ایسے بیان کرتے جیسے اس سے پشتوں سے ان کے تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ کونسا ایسا صاحب حیثیت مہاجر خاندان تھا جہاں ان کے مرید اور مداح نہیں تھے۔ ہر گھر میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ ختنوں اور عقیقہ سے لے کر شادی بیاہ تک ان کے ہر کام کاج میں شریک' ہر دکھ درد میں شامل' شادی غمی کے موقعوں پر منتظم' فیصلوں کے موقعوں پر مشیر۔

مجو بھائی کی یہی خوبی ان کا عیب بن گئی۔ اغیار نے کس کس خفیہ کارخانے سے ان کا رشتہ جوڑا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ شہر میں جو فتنہ بھی اٹھتا اور اس فتنہ کا جس خفیہ کارخانے سے جا کر رشتہ ملتا اس کا پانی ہر پھر کر مجو بھائی کے نشیب میں مرتا۔

غیبی امداد کے معمہ کو بھی یاروں نے اپنے حساب سے حل کر لیا۔ ''تو تم سمجھتے ہو کہ یہ بھی کوئی کھل جا سم سم والا چکر ہے۔''

''اگر یہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔''

''یار یہ پرمٹوں لائسنسوں کا چکر ہے۔''

''خیر یہ تو کوئی چکر نہیں ہے۔ ادھر لیا ادھر بیچ دیا۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری' رنگ چوکھا۔''

بس ایسی ہی باتیں ہو رہی تھیں اور میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ جب ضبط نہ ہو سکا تو ایک سے الجھ پڑا۔ بات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ مجو بھائی تک پہنچی۔ انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''اماں' تم کوئی خدائی فوجدار ہو۔ اگر کسی کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے تو تمہیں کیا۔''

میرا بھی اس وقت پارہ چڑھا ہوا تھا۔ میں مجو بھائی پر برس پڑا۔ ''مجو بھائی' یہ جو آپ نے سانپوں کو دودھ پلانے کا شیوہ اختیار کر رکھا ہے یہ آخر کیا ہے۔ آپ سے سفارشیں کراتے ہیں' فائدے اٹھاتے ہیں۔ اور پھر شگوفے چھوڑتے ہیں۔''

''استاد آج تو تمہارا پارہ بہت چڑھا ہوا ہے۔'' مجو بھائی خود فوراً ٹھنڈے ہو گئے اور اب مجھے ٹھنڈا کرنے کوشش کرنے لگے۔ ''مگر یار' اس میں غصے کی کیا بات ہے۔ کووں کے ڈھول بجانے سے کوئی مرا کرتا ہے۔ چلو چل کر کافی پیتے ہیں۔''

خیر۔ ذکر تو میں اپنا کر رہا تھا۔ بیچ میں مجو بھائی نکل آیا۔ نکلنا ہی تھا۔ اپنی زندگی کو کسی بھی زاویئے سے دیکھوں مجو بھائی ہمیشہ اس میں شامل نظر آئے۔ اور خاص طور پر ان شروع کے دنوں میں۔ بس جیسے میں ان کی انگلی پکڑ کر چل رہا تھا۔ سر چھپانے کیلئے چھت انہیں

KitaabPoint.blogspot.com

کے طفیل میسر آئی تھی۔ خالی چھت نہیں۔ پہلی نوکری بھی انہیں کے وسیلہ سے ملی تھی۔ بس ایک روز اچانک نوٹس دے دیا۔ ''جواد میاں' کل جا کے مرزا صاحب سے مل لو۔''

''مرزا صاحب' کون مرزا صاحب؟''

''مرزا دلاور بیگ۔ اپنی وضع کے آدمی ہیں۔''

''ان کے دفتر میں ایک دو آسامیاں خالی ہیں۔ تم وہاں کھپ جاؤ گے۔ کل جا کے مل لو بس کام ہوا سمجھو۔ سرکاری نوکری ہے۔ اچھے رہو گے۔''

سو میں اگلے دن پہنچ گیا۔ مگر میں وہاں پہنچ کر کتنا حیران ہوا۔ دیکھتا تھا اور حیران ہوتا تھا کہ اچھا یہ سرکاری دفتر ہے۔ مرزا صاحب اس دفتر کے انچارج تھے۔ مگر ان کے کمرے کا نقشہ یہ تھا کہ ننگے فرش پر ایک بڑی سی میز' ہر قسم کے تکلفات سے بے نیاز' ایک طرف چند فائل جن پر پیپر ویٹ کے نام اینٹ کا دھلا دھلایا ٹکڑا رکھا تھا۔ برابر میں ایک طشتری میں ببول کے کانٹے سجا رکھے تھے۔ سامنے چند کاغذ' نیلی پیلی دو پنسلیں' ایسی میز سجائے مرزا صاحب بیٹھے تھے۔ سامنے دو پرانی دھرانی کرسیاں بہت شفقت سے ملے۔ نام پوچھا۔ پھر تعلیم کے بارے میں پوچھنے لگے۔ بی اے کیا ہے۔ کونسی ڈویژن میں۔ کیا مضمون تھے۔ پھر اچانک سوال داغا ''عزیز کس شہر سے نسبت رکھتے ہو؟''

''قبلہ نسبت تو گم ہو گئی۔ اب تو اسی شہر میں آوارہ پھرتا ہوں۔''

مرزا صاحب نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ چپ رہے۔ پھر بولے ''ہاں عزیز تم نے ٹھیک ہی کہا۔ میں بھی کم ہی کسی سے ذکر کرتا ہوں کہ کس اجڑے دیار سے آئے ہیں۔ کوئی بہت پوچھے تو بس اتنا کہہ دیتا ہوں کہ ''دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب'' اور چپ ہو جاتا ہوں۔''

بس اس بہانے مرزا صاحب نے دلی پر ایک پورا مضمون باندھ دیا۔ خیر یہ تو تمہید تھی۔ پھر تو یہ مضمون کسی نہ کسی بہانے بندھتا ہی رہا۔ ہاں تو مرزا صاحب دلی پر شروع تھے اور میں ہوں ہاں ہوں ہاں کر رہا تھا۔ پھر اچانک رکے اور بولے۔ ''قلم تو تمہارے پاس ہو گا؟''

میں کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ سٹپٹا سا گیا۔ ''جی نہیں..... جی..... جی ہاں' پین تو ہے۔''

''بس پین ہونا چاہیے۔ ایک آدھ پنسل بھی ہو تو اچھا ہے۔ بس کل صبح کو آ جایئے۔ میں آپ کا نام نوٹ کرا دیتا ہوں۔ باقی کار

KitaabPoint.blogspot.com

وائی ہوتی رہے گی۔اس میں وقت لگے گا۔سرکاری کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔بہرحال آپ کل آ جایئے۔"

میں دوسرے دن پین اور پنسل سے مسلح ہو کر وہاں پہنچ گیا۔مرزا صاحب دیکھ کر خوش ہوئے۔پھر کچھ ہدایت بصورت وعظ

"میرے عزیز میاں فی الحال بے سروسامانی کا عالم ہے کیا تم یقین کرو گے کہ رائے سینا میں میرا دفتر کس شان کا تھا۔میرا ے کمرے کے آگے ایک نہیں دو چپراسی بیٹھے رہتے تھے۔وزیر کو چٹ بھیج کر لمبا انتظار کرنا پڑتا تھا۔یہاں ہمارے کمرے میں نہ چق ہے نہ چپراسی۔لوگ منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔سچ پوچھو تو ابھی تک یہ دفتر ہے ہی نہیں۔میں دفتر ترتیب دے رہا ہوں۔اماں ملک ہی نہیں تھا۔دفتر کہاں سے ہوتے۔ملک اللہ توکلی بن گیا ہے۔ہم بھی اللہ توکلی یہاں آ گئے۔تو عزیز یہ سمجھ کر کام کرو کہ عمارت بن رہی ہے۔ہم معمار ہیں۔"

مرزا صاحب اچھے معمار ثابت ہوئے۔دیکھتے دیکھتے عمارت کھڑی کر لی۔وہی ٹیم ٹام جو دفتروں میں ہوا کرتی ہے۔ساتھ میں سٹاف بھی بڑھتا چلا گیا۔اور جتنا سٹاف بڑھتا گیا اتنا ہی سٹاف کی قلت کی انہیں شکایت پیدا ہوتی چلی گئی۔اور اسی حساب سے افسران بالا کی بے توجہی کے گلے شکوے۔سٹاف عجب انداز سے بڑھ پھیل رہا تھا۔ہر دوسرے تیسرے دن ایک نیا چہرہ نمودار ہوتا اور سٹاف میں شامل ہو کر ہفتے عشرے میں نیا پرانا ہو جاتا۔انہیں میں وہ چہرہ بھی تھا' دفتر کا سب سے روشن چہرہ' جو دھیرے دھیرے میرے اندر اجالا بن کر سماتا چلا گیا۔بس ہر وقت ٹائپ کرتی رہتی تھی۔کبھی جو اس خدا کی بندی نے نظر اٹھا کر دیکھا ہو۔ٹائپ کرانے کے لئے جو کاغذ لے کر جاتا ٹائپ کرتے کرتے کاغذ لے کر رکھ لیتی اور پھر اسی طرح ٹائپ میں غرق۔میں نے سوچا' ایسے تو کام نہیں چلے گا۔کاغذ دیتے دیتے کہا" یہ جلدی ٹائپ ہونا ہے۔بس ابھی پندرہ منٹ میں۔"

"جی" اور پھر ٹائپ میں منہمک ہو گئی۔

"معاف کیجئے آپ کا نام کیا ہے۔"

"عشرت النساء"

"عشرت النساء۔۔۔۔۔۔۔ نام تو بہت پر تکلف ہے۔مجھ جیسا تو اس کے تلفظ ہی میں الجھ کر رہ جائے۔"

اس نے رک کر مجھے دیکھا' بس ذرا کی ذرا۔اور پھر اپنی ٹائپ پر جھک گئی انگلیاں جو رک گئی تھیں پھر اسی طرح تیزی سے حرکت کرتی نظر آنے لگیں۔

ساون سے اس ناآشنا شہر میں بارش جب ہوتی ہے۔تو اس رنگ سے ہوتی ہے جیسے سینکڑوں مشکوں کا دہانہ ایک دم سے کھل گیا

KitaabPoint.blogspot.com

ہے۔ چاروں طرف جل تھل۔ بارش ہلکی پڑ گئی تھی۔ رکی نہیں تھی' سواری کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ بس اسے معجزہ ہی کہنا چاہیے کہ ایک رکشا بھیگتی بھاگتی عین میرے سامنے پاتھ کے برابر رکی۔ ''چلنا ہے۔'' میں نے پوچھا۔ فوراً ہی تیار ہو گیا۔

میں نے بیٹھتے بیٹھتے عشرت کی طرف دیکھا۔ اوپر سے ٹپکتی بوندوں سے بچنے کی کوشش میں کیسی سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔ میرا جذبہ ہمدردی جاگا۔ ''عشرت بی بی' بس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ پتہ نہیں کب آئے اور اس میں جگہ ملے نہ ملے۔ کہو تو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔''

انکار بھی نہیں کیا۔ آمادہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اسے مذبذب دیکھ کر کہا ''ارے اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اس موسم میں تم یہاں کب تک کھڑی رہو گی۔''

جھجکتے ہوئے بولی ''آپ کو بہت چکر پڑے گا۔''

''وہ تو پڑے گا۔ مگر ایسے موسم میں ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔'' اور پھر فوراً ہی میں نے کہا ''دیر مت کرو۔ جلدی بیٹھو۔ بارش پتہ نہیں پھر کب شروع ہو جائے۔''

اس نے تامل کیا۔ پھر جھجکتے ہوئے بیٹھ ہی گئی مگر اس طرح کہ سمٹ کر بالکل ایک کنارے سے لگ گئی۔ میں نے کہا ''اس طرح تو تم بالکل بھیگ جاؤ گی۔ ٹھیک طرح کیوں نہیں بیٹھتی ہو۔''

''نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

اب میں اصرار کیا کرتا۔ پتہ نہیں وہ کیا سمجھتی۔ رستے بھر اسی طرح سمٹی بیٹھی رہی اور بھیگتی رہی۔ دفتر میں تو وہ اچھی خاصی باتیں کر لیتی تھی۔ یہاں بالکل چپ تھی اور کچھ گھبرائی ہوئی۔ میں نے جو بھی بات کی ہوں ہاں کر کے چپ ہو گئی۔

گلی کے نکڑ پہ پہنچ کر رکشا رکوائی۔ ''میں یہیں اتر جاؤں گی۔''

میں نے باہر نظر ڈالی۔ کہیں پانی کہیں کیچڑ' میں نے کہا کہ کیسے جاؤ گی۔ کیچڑ بہت ہے۔''

''چلی جاؤں گی۔''

''پھسل جاؤ گی۔''

''نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔'' یہ کہتے کہتے اتر گئی۔

میں بھی ساتھ ہی اتر پڑا۔ رکشا والے سے کہا ''انہیں پہنچا کر ابھی آتا ہوں۔'' اور عشرت سے کہا ''لو میرا ہاتھ پکڑو۔'' اترتے ہی اسے بھی شاید پھسلن کا احساس ہو گیا تھا۔ فوراً ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلی ڈگمگاتی ہوئی۔ چلتے چلتے جب زیادہ ڈگمگانے لگتی تو زیادہ